# افریقیہ میں مُسلمانوں کا حال

## جناب خلیل حامدی صاحب

اس سے پہلے ان صفحات میں ہم "افریقیہ میں مسلمانوں کا ماضی" پیش کر چکے ہیں جس سے قارئین کرام کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ماضی میں افریقیہ کا وہ علاقہ جو اسلام اور مسلمانوں کے زیر اثر آیا تھا، جہالت و تاریکی کا پُرہول گہوارہ نہیں تھا، بلکہ تہذیب و علم کا لہلہاتا گلستان تھا۔ اسلام کی چُھوٹے نورانی طبعی رفتار کے ساتھ رواں دواں تھی۔ شرک و بُت پرستی کے حصار وحدانیت و خدا پرستی کی یلغار کے آگے زمیں بوس ہوتے جا رہے تھے۔ استبداد و جفا پیشگی کے بجائے مساوات و عدل گستری سایہ فگن ہو رہی تھی۔ اسلامی دعوت کی ضوپاش شعاعیں شمال سے نکل کر لگاتار جنوب کی جانب بڑھ رہی تھیں، اور جہاں جہاں بھی وہ پہنچ رہی تھیں وہاں تہذیب و شائستگی پھیل رہی تھی۔ اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ پندرھویں صدی عیسوی کے اوائل سے جب مغربی استعمار کے منحوس قدم اس برّاعظم کی طرف بڑھنے شروع ہوئے تو کس طرح اس براعظم کی تہذیبی تابانی تاریکی میں بدلتی چلی گئی، اور وہاں خاص طور پر مسلمان کس ظلم و ستم اور مذہبی تعصب کے شکار بنائے گئے۔

افریقیہ میں داخل ہونے کے بعد مغربی استعمار نے اُس کے مادّی وسائل پر قبضہ کر لیا اور اُن کو افریقی ممالک کی ترقی و فلاح میں صرف کرنے کے بجائے ان کا ناجائز استحصال شروع کر دیا۔ قدرتی ثروت کے وہ بے پناہ ذخیرے جن سے اس برّاعظم کا گوشہ گوشہ لبریز تھا سب کے سب ان مستعمرین کے عیش و عشرت کے لیے وقف ہو گئے۔ اور اگر ان سے افریقیوں کو کچھ استفادہ کی اجازت ملی بھی تو صرف ان لوگوں کو جو استعمار کے آلۂ کار بنے یا عیسائیت کے دائرے میں داخل ہو گئے۔

افریقیہ کی جو اقوام دعوتِ اسلامی سے متأثر ہو کر دَورِ تمدّن میں داخل ہو رہی تھیں اور وحشت و ناشائستگی اور بادیہ نشینی کو خیرباد کہہ کر مہذب شہری زندگی کی جانب رُخ کر رہی تھیں، مغربی استعمار نے

ان کے ساتھ یہ ظلم کیا کہ انہیں مستقل طور پر جنگلوں کی مخلوق بنا دیا۔ پرتگال، اسپین، برطانیہ، فرانس اور دوسرے مغربی ملکوں نے افریقہ کے مختلف حصوں پر تابڑ توڑ حملے کیے تاکہ انسانوں کو گرفتار کر کے غلام بنایا جا سکے، اور انہیں اپنی نئی مستعمرات کی تعمیر کے لیے بیگار کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔ یہ حملے بیک وقت مغربی افریقہ مشرقی افریقہ اور وسطا افریقہ میں کیے گئے۔ انسانوں کے گروہ کے گروہ "شکار" کیے گئے۔ جو پکڑ لیے گئے انہیں جانوروں سے بھی بدتر زندگی سے سابقہ پیش آیا۔ اور جو بچ گئے وہ خوف اور دہشت کے مارے جنگلوں میں چھپ گئے۔ آج خود مغربی مؤرخین یہ اعتراف کرتے ہیں کہ مغربی قومیں اس مدت میں کم از کم دس بارہ کروڑ آدمیوں کو غلام بنا کر افریقہ سے امریکہ اور دوسرے ملکوں میں لے گئی ہیں۔ اس ظلم و ستم کے نتیجہ میں شہری آبادیاں اجڑ گئیں، تہذیب و تمدن کی رفتار رک گئی، لاکھوں افریقی وسائل حیات سے دور برسوں تک صحراؤں اور غاروں میں پناہ گزین رہے، اور ان کے اندر وہ تمام خرابیاں عود کر آئیں جو محروم تہذیب اور بیگانۂ تمدن انسانوں کا خاصہ سمجھی جاتی ہیں۔ اس جرم عظیم کا سہرا مغربی اقوام کے سر ہے۔ اور اب افریقہ کی تاریخی رفتار بتا رہی ہے کہ مغرب کو اس جرم کی سزا افریقہ ہی کے ہاتھوں بھگتنی پڑے گی۔

استعمار کے داخلے کے ساتھ عیسائی مشنریوں نے بھی افریقہ پر یلغار شروع کر دی۔ بلکہ استعمار نے اپنے قدم مضبوط کرنے کے لیے عیسائی مشنریوں ہی کو ذریعہ بنایا۔ استعماری حکومتوں نے جس ملک پر قبضہ کیا اس کا نظام تعلیم عیسائی مشنریوں کے ہاتھ میں دے دیا تاکہ وہ تعلیم اور ثقافت کے ذریعہ افریقی اقوام کو نہ صرف عیسائی بنائیں بلکہ انہیں اپنے سفید فام آقاؤں کے نہایت وفادار غلام بنا دیں اور ان کے دل و دماغ پر استعمار کی محبت وفاداری کو راسخ کر دیں۔ دوسری طرف ان کی یہ مستقل پالیسی تھی کہ مسلمانوں کو تعلیم سے بالکل محروم رکھا جائے، کسی شخص کو اس وقت تک تعلیم نہ دی جائے جب تک وہ عیسائی نہ ہو جائے، اور مسلمانوں کے مقابلے میں خود افریقیوں کے اندر سے ایک ایسا گروہ تیار کر دیا جائے جو مذہباً عیسائی ہو، تعلیم اور تہذیب کے اعتبار سے مسلمانوں سے فائق تر ہو، ملکی وسائل و ذرائع صرف اس کے ہاتھ میں ہوں، اور حکومت کے نظم و نسق پر صرف اسے تصرف حاصل ہو تاکہ اس کے مقابلے میں افریقہ کا مسلمان آئندہ کبھی سر اٹھانے کی ہمت نہ کر سکے، اور مسلم اکثریت کے علاقوں میں بھی مسلمان کبھی حکمران نہ بن سکیں۔

افریقہ کی مسلمان قوموں نے استعمار کا راستہ روکنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اِس لعنت سے افریقہ کو محفوظ رکھنے کے لیے انہوں نے قدم قدم پر اس کا مقابلہ کیا۔ مگر تاریخی عوامل استعمار کے قدم مضبوط کرتے چلے گئے۔ اسپین اور پرتگال میں اسلامی اقتدار کا خاتمہ، بحری طاقت میں مسلمانوں کی کمزوری، عیسائی اقوام کی اسلام دشمنی، مسلمانوں کے ہاتھوں صلیبی جنگوں میں شکست کھا جانے کی وجہ سے ان کے اندر انتقامی جذبات کا نشوونما، یورپ کی روز افزوں صنعتی ترقی، یہ سب اسباب افریقہ میں استعمار کے داخلے کے لیے راہیں ہموار کر رہے تھے۔ بیسویں صدی کے ربع اوّل کے اختتام سے پہلے پورے براعظم افریقہ پر استعمار کا تسلط مکمل ہو گیا۔ اور چونکہ استعمار کے اصل حریف مسلمان تھے، اس لیے اس نے مسلمانوں ہی کو خصوصی تشدّد و انتقام کا ہدف بنایا۔ آئندہ صفحات میں ہم مختلف عنوانوں کے تحت مغربی استعمار کے اس سلوک کو بیان کریں گے جو اُس نے افریقہ کی مسلم اقوام کے ساتھ روا رکھا ہے۔

اس بحث سے ہم ایک اور پہلو کو بھی اُجاگر کرنا چاہتے ہیں۔ مغربی اقوام آج ہمیں رواداری اور مذہبی بے تعصبی کا درس دیتے ہوئے نہیں تھک رہی ہیں اور ہمارے ہاں بہت سے سادہ لوح حضرات ان سے یہ سبق خوب حاصل کر رہے ہیں۔ وہ ہم سے کہتے ہیں کہ مذہب کے معاملہ میں آدمی کو بڑا فراخ دل ہونا چاہیے، مذہب کی بنا پر انسان اور انسان میں کوئی فرق نہ کرنا چاہیے، اور کسی شخص کے ساتھ اس لحاظ سے کوئی امتیازی برتاؤ نہ کرنا چاہیے کہ وہ تمہارے مذہب سے تعلق نہیں رکھتا۔ ہمارے ہاں بہت سے "عقل مند" ایسے ہیں جو بڑی سعادت مندی کے ساتھ اُن کی اِس تلقین کو قبول کرتے ہیں، عیسائی مشنریوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں، ان کے مدرسوں اور کالجوں اور ہسپتالوں کو بڑی فراخ دلی کے ساتھ مسلمانوں کے قومی خزانے سے گرانٹ دیتے ہیں، اور بسا اوقات مفت زمینیں تک انہیں دے ڈالتے ہیں۔ اب ذرا دیکھیے کہ جو لوگ ہمیں یہ سبق دے رہے ہیں، انہوں نے خود افریقہ میں مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا ہے اور اِس بیسویں صدی کے نصف دوم میں بھی وہ کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔

افریقہ کے بارے میں آگے ہم جو کچھ بیان کریں گے اُس کی بنیاد زیادہ تر بریگیڈیر گلزار احمد صاحب

کی کتاب تذکرہ افریقہ ہے۔ اگرچہ ہمارے پاس اس معاملے میں دوسری معلومات کا بھی بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ مگر ہم اس کو چھوڑ کر بریگیڈیر صاحب کی فراہم کی ہوئی معلومات پر اس لیے انحصار کر رہے ہیں کہ وہ ہماری حکومت کے ایک سرکاری مشن پر وہاں گئے تھے، ہمارے اپنے ملک کے ایک ذمہ دار مبصر کی حیثیت سے انہوں نے وہاں حالات کا مطالعہ کیا تھا، اور انہوں نے قریب ترین زمانے میں (یعنی ۱۹۶۰ء میں) عین اس وقت یہ حالات دیکھے تھے جب بیشتر افریقی قومیں آزاد ہو رہی تھیں۔ ان کے بیانات کو آسانی کے ساتھ نہ یہ کہہ کر رد کیا جا سکتا ہے کہ یہ شاید پرانی باتیں ہونگی، اور نہ یہ کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے کہ نہ معلوم غیر ممالک کے مصنفوں اور اخبار نویسوں نے حقیقت کے ساتھ اپنی طرف سے کیا کچھ ملا دیا ہوگا۔

غلاموں کی تجارت | داھومی کے حالات کے تحت صاحب موصوف لکھتے ہیں:

"پرتگالی اور فرانسیسی یہاں کی حکومت کی طرف توجہ نہ دیتے تھے۔ ان کا مقصد غلاموں کی تجارت تھا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں غلاموں کی تجارت بیس ہزار سالانہ سے گھٹ کر بمشکل دس ہزار رہ گئی۔ اس کے باوجود وہ تجارت کرتے رہے۔ جب غلاموں کی تجارت غیر قانونی قرار دے دی گئی، اس وقت بھی داھومی سے غلاموں کی تجارت ہوتی رہی ... آخری جہاز جو اس ملک سے غلام لے کر روانہ ہوا وہ پرتگالی جہاز تھا۔ یہ ۱۸۵۸ء کا واقعہ ہے۔ اب تک یورپی اقوام نے محض چند قلعوں پر قبضہ کر رکھا تھا جہاں وہ غلاموں کو جمع کرتے رہتے تھے اور جہاز آنے پر انہیں برآمد کر دیتے تھے" (ص ۳۷)

سینی گال کے حالات میں لکھتے ہیں:

"یہاں ساحل کے قریب ہی ایک جزیرہ ہے۔ گورے نام ہے۔ جزیرہ میں سب سے پرانا قلعہ پرتگالی دور کا ہے ... شمال مغربی کونے پر ایک چٹان واقع ہے۔ اس پر قدرے بڑا مگر بیشتر زمین دوز قلعہ ہے۔ یہ فرانسیسی دور کا ہے۔ فرانس اور انگلستان کی جنگوں کے زمانے میں یہ جزیرہ پندرہ بیس سال تک انگریزوں کے ہاتھ میں بھی رہا ہے۔ اکثر مکان پرانے ہیں۔ ان مکانوں میں سولہویں صدی سے انیسویں صدی کے اوائل تک غلام

بند رکھے جاتے تھے۔ اور جب کبھی یورپ سے جہاز آتے تو ان میں سوار کر دیئے جاتے تھے ایک مکان تفصیل سے دیکھا۔ قلعوں کے تہ خانوں کی طرح تنگ و تاریک کوٹھڑیاں۔ مکان کا ایک دروازہ سمندر کی طرف کھلتا ہے۔ اس میں سے غلام نکال کر کشتیوں میں سوار کیے جاتے تھے۔ جزائر غرب الہند اور امریکہ کے کھیتوں پر کام کرنے کے لیے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ہر سال غلام افریقہ سے لے جائے جاتے۔ آدھے تو راستے میں ہی بھوک، پیاس اور مار پیٹ کا شکار ہو جاتے۔ کچھ سمندر میں کود کر عذاب سے نجات پاتے اور باقی ماندہ خود اور آئندہ کی نسلوں کے لیے غلامی پر مجبور کیے جاتے۔" (ص ۱۰۲)

گھانا کے حالات کے تحت لکھتے ہیں:

"آج صبح (۱۲ جون ۶۰ء) سٹوفر قصر بھی دیکھا۔ یہ سترھویں صدی کی عمارت ہے۔ ڈنمارک والوں نے اس کی تعمیر کی۔ عمارت کے بعض حصے بعد میں اٹھارویں صدی کے دوران اضافہ کیے گئے۔ اس میں غلاموں کو بند رکھا جاتا تھا۔ جہاز آنے پر انہیں نیچے ہی نیچے سمندر تک لے جایا جاتا۔ اور وہاں سے کشتیوں میں ڈال کر جہاز تک پہنچا دیئے جاتے۔ قید خانوں کا منہ کنوئیں کی طرح کھلتا ہے۔ یہی دروازہ ہوا کرتا تھا۔ غلاموں کو اس میں اتار کر سیڑھی کھینچ لی جاتی تھی۔ کچھ حوالات کی قسم کے کمرے بھی ہیں۔ نہایت مضبوط۔ لوہے کے دوہرے دروازے، کھڑکیوں میں لوہے کی موٹی سلاخوں کی تین قطاریں۔ دوسری طرف ایک اور قید خانہ ہے۔ یہ بھی سمندر کی طرف کھلتا ہے۔ کچھ حصہ انیسویں صدی کا ہے... اب یہ عمارت عام طور پر خالی رہتی ہے۔ صرف سرکاری دعوتوں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ سامنے باغ ہے۔ چمن، روشیں، پھولوں کی کیاریاں۔ ان کو دیکھ کر احساس بھی نہیں ہوتا کہ کبھی اس جگہ قدم رکھنے کے معنی دائمی غلامی کے ہوا کرتے تھے۔ عقبی جانب کی دیوار سے سمندر کی لہریں ٹکراتی ہیں۔ اور مسلسل شور بپا کرتی رہتی ہیں۔ اس شور میں شاید ان سینکڑوں روحوں کی چیخ پکار بھی شامل ہو جنہوں نے ان کال کوٹھڑیوں کی دیواروں

کے تھے سر پٹخ پٹخ کر غلامی سے نجات حاصل کی ہو گی ۔ غلاموں میں مرد، عورتیں اور بچے بھی شامل ہوتے تھے۔ سننے میں آیا ہے کہ یورپی داروغاؤں کے خلاف اکثر یہ شکایت ہوتی تھی کہ وہ لڑکیوں کی عصمت دری بے دریغ کیا کرتے تھے"۔ (ص ۱۶۸)

کیمرون مغربی افریقہ کے ساحل پر ایک ریاست ہے۔ پہلی عالمی جنگ تک جرمن مقبوضات میں شامل تھی۔ جنگ کے بعد زیادہ حصہ فرانس کو امانت کے طور پر دیا گیا۔ تھوڑا حصہ جو برطانیہ کو دیا گیا دو حصوں میں بٹ گیا: شمالی کیمرون اور جنوبی کیمرون۔ شمالی حصّہ کی اکثریت مسلمان ہے اور جنوبی حصّہ کی اکثریت عیسائی۔ کیمرون کے تحت مصنّف تذکرۂ افریقہ میں لکھتے ہیں:

"یورپ نے یہاں اشیاء کی تجارت کی بجائے غلاموں کی تجارت کی۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلامی سے بچنے کے لیے افریقہ کی آبادی پہلے کی نسبت اور زیادہ جنگلوں میں پناہ گزین ہونے لگی۔ جب غلاموں کی تجارت ختم ہوئی تب جا کر وہ جنگلوں سے نکلنے پر آمادہ ہوئے۔ اس دوران ان کی ابتدائی تہذیب بھی مٹ چکی تھی" (ص ۲۵۵)

اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ ان کی ابتدائی تہذیب مٹ گئی اور وہ انسانی تمدّن کے قافلے سے جُدا ہو گئے، بلکہ انہیں خود انسانوں سے سخت وحشت ہو گئی اور وہ انسانوں کا سامنا کرنے سے خوف کھانے لگے۔ جنگل کے درندوں اور اژدہوں سے انہیں کوئی خطرہ محسوس نہ ہوتا تھا، جنگل کی تاریکی اور سنسناہٹ ان کو ہراساں نہ کرتی تھی، جنگل کے غار اور کھوہ ان کو اپنے گھروں سے زیادہ پُرسکون محسوس ہو رہے تھے۔ اگر انہیں کسی چیز سے خطرہ و خوف لاحق رہتا تھا تو وہ انسان تھا۔ انہی جیسا سیاہ فام اور سیدھا سادہ انسان نہیں، بلکہ "متمدن" اور "مہذّب" انسان۔ سفید رو انسان۔ "رواداری" کا ڈھنڈورا پیٹنے والا انسان۔ اس انسان کا سایہ بھی اگر وہ دیکھ لیتے تو اُن کے بوڑھے اور جوان، اُن کی عورتیں اور بچے بلبلا اُٹھتے اور موت کو آوازیں دینے لگتے۔ اس وحشت و سراسیمگی کی حالت میں یہ لوگ جنگل میں رہ کر، انسانی دنیا کا سامنا کیے بغیر، اپنی ضروریاتِ زندگی کس طرح پوری کرتے تھے، اس کی تفصیل بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ مصنفِ "تذکرۂ افریقہ" نے گھانا کی رُوداد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"موجودہ گھانا کے اکثر اضلاع کے باشندے مستقل طور پر جنگلوں میں رہنے لگے متمدن اقوام سے ملنے میں حجاب محسوس کرتے تھے . . . . آبادیوں سے ان غریبوں کا لین دین عجیب و غریب طریقہ پر ہوا کرتا تھا۔ جنگل کے کنارے پہنچ کر تاجر چند روز تک ڈھول بجاتے رہتے۔ جوں جوں جنگل کے قبائل ڈھول کی آواز سنتے وہ جنگل کے کناروں کے قریب اکٹھا ہونا شروع ہو جاتے اور جواباً ڈھول سے اطلاع دیتے کہ آگئے ہیں۔ دو یا تین دن کے بعد تاجر ڈھول بجا کر چند میل عقب میں چلے جاتے، اور لائی ہوئی اشیاء کی گٹھڑیاں کھول کر انہیں قطار میں رکھ جاتے۔ قبائل جنگل سے نکل کر آتے اور اشیاء پسند کرتے۔ ہر شے کے مقابلے میں مناسب مقدار کا سونا رکھ دیتے۔ ڈھول بجاتے اور جنگل میں چھپ جاتے۔ تاجر جب آتے تو سونا دیکھتے۔ اگر مقدار قبول ہوتی تو سونا لے گئے اور اشیاء چھوڑ گئے۔ ورنہ پھر ڈھول بجاتے اور عقب میں چلے جاتے۔ قبائل دوبارہ آتے اور مزید سونا رکھتے، یا نہ رکھتے۔ جب تاجر بالآخر اپنے تئیں کافی سونا حاصل کر لیتے تو چلے جاتے اور نمک اور دیگر ضروریات قبائل کے لیے چھوڑ جاتے۔" (ص ۱۷۲)

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مغرب کی ان "مہذب" اقوام نے افریقہ میں غلاموں کا شکار کرنے کی جو مہمات مدتہائے دراز تک جاری کیے رکھیں، انہوں نے افریقہ کے باشندوں کو کس حال تک پہنچا دیا تھا۔ اس داستان کی تکمیل کے لیے ہم بریگیڈیر صاحب کے بیانات پر مزید اضافہ کرتے ہیں "تاکہ" رواداری" کی علمبردار اقوام کا تاریخی کردار پوری طرح کھل کر سامنے آجائے اور انسانیت کے بارے میں انہوں نے جو موقف ماضی قریب میں اختیار کیے رکھا ہے اُس کی روشنی میں اُن کے حال کے دعووں کا جائزہ لیا جا سکے۔

افریقہ میں غلاموں کو "شکار" کیسے کیا جاتا تھا، اس کی تصویر بین کرافٹ (BAIN CRAFT) نے اپنی کتاب ہسٹری آف دی یونائیٹڈ اسٹیٹس میں یوں پیش کی ہے:

"افریقہ میں غلاموں کے حاصل کرنے کا سیدھا طریقہ یہ ہے کہ رات کے اندھیرے میں گاؤں پر حملہ کیا جائے۔ بندوقیں سر کی جائیں۔ اور اگر ضرورت سمجھی جائے تو گھر میں

مزید فضا کے لیے گاؤں کو آگ لگا دی جائے ۔ اور جب گاؤں کے بدبخت لوگ آگ کے شعلوں سے بچنے کے لیے ننگ دھڑنگ بھاگ کھڑے ہوں تو ان کو پکڑ لیا جائے اور جو مزاحمت کرے اُسے گولی مار دی جائے" (ص ۶۸)

یہ افریقی انسان جس بیدردی اور سفاکی کے ساتھ امریکہ پہنچائے جاتے تھے اور ان کے ساتھ جس بے حیائی کا سلوک کیا جاتا تھا اُس کی چند جھلکیاں نائیجیریا کے سابق انگریز گورنر سر الین برنز کی زبانی سنیے ۔ وہ اپنے ایک ہم مذہب پی ۔ ایف برٹن کے حوالے سے لکھتے ہیں :

"لمبے سفر میں غلاموں کے جہازوں میں جو غلام ٹھونسے جاتے تھے گرمیوں کے موسم میں بحر اوقیانوس کو پار کرتے ہوئے ان کی جو حالت ہو جاتی تھی اُس سے یہ بات طشت از بام ہو جاتی ہے کہ کیوں ہر سفر میں بیسیوں غلام مر جاتے تھے ، اور کیوں بچے کھچے موت سے بھی بدتر تکالیف سے نجات پانے کی خاطر موقع ملتے ہی سمندر میں کود جایا کرتے تھے ۔ کھانے پر مجبور کرنے کی غرض سے عورتوں اور مردوں کو کوڑے لگائے جاتے تھے ۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ غلاموں کو اپنا منہ کھولنے پر مجبور کرنے کے لیے گرم لوہا استعمال کیا جاتا تھا تاکہ وہ ایسی غذا زہر مار کر سکیں جس کو شدید بیماری اور اذیت کی وجہ سے وہ بخوشی نہ کھا سکتے تھے ۔ اُن کو ناچنے اور گانے پر آمادہ کرنے کے لیے کوڑے لگائے جاتے تھے تاکہ وہ اپنی بدقسمتی کا احساس نہ کر سکیں ۔ جہاز کے عہدیداروں اور ملاحوں کو عورتوں کے معاملے میں غیر محدود اختیارات حاصل تھے ۔ غلام مردوں کو ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کے ساتھ باندھا جاتا تھا اور ان کو اکثر ایک دوسرے پر اس طرح ٹھونسا جاتا تھا کہ وہ صرف ایک پہلو پر لیٹ سکتے تھے ۔ ان میں ایک دوسرے کے درمیان صرف ڈیڑھ فٹ بلندی کے تختے ہوتے تھے تاکہ وہ پہلو نہ بدل سکیں ۔ ۱۷۸۵ء کے قریب ایک جہاز سات سو غلاموں کو لے کر چلا ، اور اس قدر کھچا کھچ بھرا ہوا تھا کہ موسم کی کسی خاص خرابی یا معمول سے زیادہ لمبے سفر کے بغیر بھی انہیں ایسی ہلاکت انگیز تکالیف پہنچیں کہ جہاز کے ویسٹ انڈیز پہنچنے سے قبل نصف کے قریب غلام

دم توڑ گئے۔"

"جہاز سے اُتارے جانے کے بعد بھی ان کو شدید تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ زنجیروں میں باندھ کر ان کے بے رحم شکاری ان کو ساحل کے لاتے اور تکلیف دہ فاصلے طے کراتے، اور فروخت کرنے سے پہلے ان کو کٹہروں میں جمع کیا جاتا تھا۔ چنانچہ غلاموں کا ایک ڈچ تاجر جو سترھویں صدی کے اواخر میں مغربی ساحل پر رہتا تھا اور جس کا نام ولیم بوس مین تھا لکھتا ہے کہ جب یہ ملازم آتے تو سب کو قید خانے میں ٹھونس دیا جاتا، اور جب ہم ان کو فروخت کرنا چاہتے تو ہمارے سپاہی ایک کھلے میدان میں لاتے۔ وہاں انہیں مکمل برہنہ کر کے معاینہ کیا جاتا۔ اس معاینے میں مرد و عورت کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ اسی اثنا میں لوہے کی ایک سلاخ گرم کی جاتی تھی جس پر کمپنی کا نام یا نشان کندہ ہوتا تھا۔ اس سلاخ سے کمپنی کا نام یا نشان ان کے سینوں پر داغا جاتا تھا۔"

غلام سازی اور انسانیت سوزی کا یہ کاروبار کس قدر وسیع پیمانے پر ہوا اس کا اندازہ ذیل کے اقتباسات سے آپ لگا سکتے ہیں:

"سنہ ۱۶۸۸ء اور سنہ ۱۷۰۰ء کے درمیان انگریزوں نے افریقہ سے تین لاکھ غلام برآمد کیے۔ انگریزوں کو اسپین کے ساتھ ایک معاہدہ کے تحت یہ خاص ٹھیکہ ملا ہوا تھا کہ وہ اسپینی ویسٹ انڈیز میں چار ہزار آٹھ سو سالانہ کے حساب سے نیگرو سپلائی کریں۔ ۱۷۰۰ اور ۱۷۸۶ء کے درمیان انگریزوں نے جمیکا میں چھ لاکھ دس ہزار غلام درآمد کیے۔ راستے میں بھی بہت بڑی تعداد مر گئی (جو اس تعداد میں شامل نہیں ہے)"

یہ اعداد صرف انگریزوں کے "شکار کردہ" غلاموں کی تعداد کو ظاہر کرتے ہیں۔ ایک اور مصنف ان کی کم از کم تعداد ڈیڑھ کروڑ بتلاتا ہے۔ دوسری یورپی اقوام نے امریکہ کو جو غلام سپلائی کیے ہیں ان کی تعداد کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ڈوڈلے اسٹامپ کا بیان ہے:

"تخمینہ کیا گیا ہے کہ صرف فرانسیسی مقبوضات سے تین صدیوں کے اندر ایک کروڑ بیس

لاکھ غلام حاصل کیے گئے۔ اور اس سے نچلے علاقے سے پرتگالیوں نے جو غلام حاصل کیے وہ اس سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ اگر پرتگال کے حاصل کردہ غلاموں کی تعداد ایک کروڑ ستر لاکھ فرض کی جائے تو مجموعی تعداد تین کروڑ ہوتی ہے[1]۔"

محققین نے ان غلاموں کی مجموعی تعداد کے بارے میں جو اعداد و شمار جمع کیے ہیں اُن کی رُو سے یہ تعداد چھ کروڑ ہو جاتی ہے۔ اور یہ ان بدقسمت انسانوں کی تعداد ہے جو امریکہ کے ساحلوں پر زندہ پہنچ گئے۔ اور اگر اُس تعداد کو بھی ان میں شامل کر لیا جائے جو راستہ ہی میں دم توڑتی رہی تو اس حساب سے غلاموں کے شکاریوں نے بارہ کروڑ افریقیوں کو گرفتار کیا۔

ان مظالم کے بارے میں عیسائیت نے جو کردار ادا کیا ہے اُس کا بیان بھی بے محل نہ ہوگا: ڈاکٹر بلائیڈن نے اپنی کتاب میں پادری رائٹ ریورنڈ ولیم میڈس کی کتاب مواعظ کا اقتباس درج کیا ہے جو اُس نے آقاؤں اور غلاموں کے لیے لکھی تھی۔ اس کتاب مواعظ میں پادری صاحب غلاموں کو تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"خدائے بزرگ و برتر اس جہان میں تم کو غلام بنا کر راضی ہوا۔ اس نے اس جہان میں تمہاری تقدیر محنت اور افلاس کے لیے بنائی ہے جس کے سامنے تمہیں سرِ اطاعت خم کرنا چاہیے۔ یہی مرضیٔ الٰہی ہے اور یہی ہونی بھی چاہیے۔ تم جانتے ہو کہ تمہارے جسم تمہارے اپنے نہیں ہیں بلکہ تمہارے حاکموں کی مرضی اور اختیار میں ہیں[2]۔"

یہ ہے مغربی اقوام کے اس "روادارانہ" سلوک کا ہلکا سا نقشہ جو افریقی انسان کے ساتھ انہوں نے صدیوں تک اختیار کیے رکھا۔ اور لطف یہ ہے کہ آج مغربی اقوام اپنے اس شرمناک ریکارڈ پر پردہ ڈالنے کے لیے اسلام اور مسلمانوں کے ہاں "غلامی" کے رواج کا ڈھنڈورا پیٹتی ہیں تاکہ دنیا اُن پر پھٹکار بھیجنے کے بجائے مسلمانوں کو موردِ الزام ٹھیرائے۔

---

[1] AFRICA, DUDLE STAMP

[2] CHRISTIANITY ANDISLAM, THENEGRO RACES

سیرالیون کی کریول آبادی | اس قصّے کا ایک اور دلچسپ پہلو ہے۔ مغربی اقوام نے افریقی باشندوں کو غلام بنا کر اپنے کھیت آباد کرنے اور اپنے کارخانے چلانے کی خدمت تو خوب لی۔ مگر جب کچھ عرصہ بعد غلام سازی کے خلاف بعض انسانی ضمیروں نے احتجاج کیا اور غلامی ممنوع قرار دے دی گئی تو پھر یہی غلام انہیں اپنی سرزمین پر چلتے پھرتے ناگوار گزرنے لگے۔ فری ٹاؤن سیرالیون کا دارالحکومت ہے۔ اس کی تاسیس کیسے عمل میں آئی، اس کے بارے میں "تذکرۂ افریقہ" کے مصنّف کا بیان ملاحظہ ہو:

"فری ٹاؤن کی ابتداء کچھ عجیب طریقہ پر پڑی۔ جب انیسویں صدی میں غلامی ممنوع قرار دے دی گئی تو وہ غلام جنہوں نے امریکہ کی جنگِ آزادی میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا، ان کو کہیں آباد کرنے کا مسئلہ درپیش ہوا۔ انہی دنوں انگلستان کے ایک ساحلی شہر دلیمتھ، نے اپنے ہاں کی تیس پیشہ ور عورتوں کو ملک بدر کر دیا۔ ان آزاد شدہ غلاموں اور تیس بیسواؤں نے مِل جُل کر اس شہر کی بنا ڈالی۔ بعد میں کچھ آزاد شدہ اور کچھ بھاگے ہوئے غلام غرب الہند کے جزائر اور دوسرے مقامات سے یہاں آگئے۔ چونکہ ان کو برطانوی بحری بیڑے نے یہاں آباد کیا تھا اس لیے وہ برطانیہ کے ساتھ وابستہ رہے۔ جلد ہی مشن بھی آنا شروع ہو گئے اور عیسائیت کو فروغ ہوا" (ص ۱۳۲)

یہ نسل اب کریول کے نام سے مشہور ہے۔ شروع میں ان کی تعداد ۱۲۵۱ تھی جو اب تیس ہزار تک پہنچ چکی ہے۔ ان میں مسلمان بھی ہیں، جو تعداد میں کم ہیں۔ اور باقی مسلمانوں کے ساتھ بے تکلف ملتے جلتے ہیں۔ ان پر یورپی رنگ اتنا نہیں چڑھا جتنا کہ عیسائی کریول آبادی پر ہے۔ مصنّف تذکرۂ افریقہ ایک کریول سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وزیر مالیات سے ملاقات ہوئی مسلمان ہیں۔ نام مصطفیٰ[1] ہے۔ فری ٹاؤن کے رہنے والے ہیں اور کریول آبادی سے تعلق رکھتے ہیں۔۔۔ مصطفیٰ صاحب کا خاندان ضرور مسلمان

---

[1] آگے چل کر مصنّف تذکرۂ افریقہ نے بیان کیا ہے کہ مصطفیٰ صاحب ان کی موجودگی میں سیرالیون کے نائب وزیراعظم نامزد ہو گئے تھے۔ اور سیرالیون کی مسلم کانگرس کے زیر اہتمام ایک جلسہ میں انہوں نے تقریر کی اور احمدیہ جماعت (قادیانیوں) کی تعلیمی خدمات کا اعتراف کیا۔

ہو گا۔ اور ایسا مسلمان کہ اِس افراتفری اور بعد کی مشن نوازی کے باوجود اسلام پر قائم رہا۔ اس طرح کے مسلمان بہت کم ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شروع سے ہی ان غلاموں میں مسلمان کم تھے یا انہوں نے بعد میں اسلام چھوڑ دیا۔ نہ معلوم کتنے ہزاروں، لاکھوں ہوں گے جنہوں نے امریکہ اور جزائر غرب الہند پہنچ کر اسلام چھوڑ دیا۔" (۱۳۵)

نفسیاتی، ذہنی اور تہذیبی لحاظ سے کریول آبادی جس سطح کی ہے اُس کے بارے میں مصنف "تذکرۂ افریقیہ" کا بیان ہے کہ:

"وہ اپنے آپ کو آزاد شدہ غلاموں کی اولاد سمجھتے ہیں۔ اور چونکہ ایک بار یہاں سے جا کر واپس آئے تھے اس سبب اپنے آپ کو افریقیوں سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ بلکہ بقول ایک مصنف یہ اپنے آپ کو "سیاہ انگریز" سمجھتے ہیں۔ دو سو سال کے انگریزی تعلقات کی وجہ سے ان میں تعلیم زیادہ ہے۔ اکثر ملازمتیں ان ہی کے پاس ہیں۔ اب وہ پورے ملک کی آزادی پر ناخوش ہیں۔ بلکہ کھلم کھلا کہتے ہیں کہ برطانیہ نے اُن کو محفوظ علاقوں کے ساتھ ملا کر اقلیت میں بدل دینے میں زیادتی بلکہ بے وفائی کی ہے۔ ان کے رہنے سہنے کا طریقہ، ان کی زبان، بلکہ ان کی ذہنی ساخت بالکل انگریزی ہے۔ انگلستان کی طرف حسرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ کب زیارت ہو گی۔ بادشاہوں اور شہزادوں، شہزادیوں کی تصویریں اُن کے گھروں میں افراط سے ملیں گی۔ اَن پڑھ سے اَن پڑھ انگریزی بولتا ہے۔ گو یہ انگریزی یہاں کی خاص زبان ہے جسے "کبوتر انگریزی" کہتے ہیں۔ فوراً کو ONE TIME کہتے ہیں۔" (۱۳۵)

مصنفِ "تذکرۂ افریقیہ" نے یہ بھی تحقیق کی ہے کہ "کریول جب یہاں آ کر آباد ہوئے اور نیس انگریز بیسواؤں سے اُن کی نسل کا آغاز ہوا تو بعد میں بھی کریول خون میں انگریز ملاحوں، سیاحوں، فوجی سپاہیوں، انتظامی افسروں کا خون وقتاً فوقتاً ملتا رہا اور جُوں جُوں تعلقات بڑھے، تمدن کا رنگ بھی اسی قدر گہرا چڑھتا گیا اور وہ اپنے آپ کو بچھڑے ہوئے انگریز سمجھنے لگے۔" (۱۳۶)

**لائبیریا کے امریکی نژاد افریقی** | فری ٹاؤن کی طرح لائبیریا کے قدیم شہر مان روڈیا کی ابتدا بھی دلچسپ طریقے سے ہوئی ہے۔ اس کی تعمیر میں بھی مغربی اقوام کی یہی ذہنیت کام کر رہی تھی کہ افریقی غلاموں کے آزاد ہو جانے کے بعد انہیں سفید فام نسل کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرنے کا موقع نہ ملنا چاہیے۔ کیونکہ افریقی غلاموں کی حیثیت ان کی نگاہ میں کاشتکاری کے بیل سے بڑھ کر نہیں ہے۔ بیل اگر بوڑھا ہو جائے یا مالک کو اس سے کوئی دلچسپی نہ رہے تو اسے اپنے مالک کی چراگاہ میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

تذکرۂ افریقہ کے مصنف لکھتے ہیں:

"۱۸۱۷ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ایک انجمن وجود میں آئی جس نے اپنا مقصد یہ مقرر کیا کہ امریکہ میں جو غلام آزاد کیے گئے ہیں انھیں واپس افریقہ بھیج دیا جائے اور وہاں آباد ہونے میں اُن کی مدد کی جائے۔ اس انجمن کا سب سے بڑا کارنامہ لائبیریا کا سنگِ بنیاد ہے۔"

بظاہر یہ آبادکاری انسانیت کی خدمت کے جذبہ کی عکاس نظر آتی ہے مگر اس کی ناموزونیت کے بارے میں تذکرۂ افریقہ کے مصنف کا بیان ہے کہ: "اس خیال کے بانی نہ معلوم کیوں سیاہ فام باشندوں کو امریکہ سے نکالنا چاہتے تھے۔ بہرکیف وہ یہ بھول گئے کہ اُن کی پست حالت، ناخواندگی اور غربت کے باوجود اب وہ متمدن ماحول کے عادی ہو چکے تھے۔ اب اُن کا امریکہ کو چھوڑ کر پھر افریقہ کے جنگلوں کی زندگی اختیار کرنا ناممکن سی بات تھی۔ یہ مقامی قبائل کے ساتھ رہنے کے ناقابل ہو چکے تھے۔" اور یہ آبادکاری بھی جس طریقے سے کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ: "اس پر مزید غلطی یہ کی گئی کہ جو مدد انہیں دی گئی وہ ناکافی تھی۔ یہاں انہیں ہر طرح کی تکالیف پیش آئیں۔ جسمانی تکالیف، نئی آبادی کا وجود میں لانا، موسم کی ناسازگاری اور ذہنی اضطراب کے علاوہ اردگرد کے باشندوں سے جو تکالیف ملنا شروع ہوئیں وہ بہت زیادہ تھیں۔"

اس امریکی نژاد افریقی آبادی نے جب افریقی قبائل کے درمیان جنم لیا تو افریقی قبائل کو یہ بات ناگوار گزری اور دونوں کے درمیان کشمکش کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ مصنف کا بیان ہے:

"اس چھوٹی سی آبادی پر حملے ہونا شروع ہوئے، مگر یہ جنگ کے نئے ڈھنگ اب امریکہ میں دیکھ آئے تھے اور بعض سیکھ بھی آئے تھے۔ پہلے انہوں نے اپنے علاقہ کا دفاع کیا اور پھر آگے بڑھ کر دوسرے علاقوں کو اپنی تحویل میں لینا شروع کر دیا۔ گرمان روڈ یا شہر جہاں یہ لوگ امریکہ سے آکر آباد ہوئے تھے، یہ اس تمام عرصہ میں ان کا وطن رہا۔ باقی علاقہ ان کا افریقی مقبوضہ شمار ہوُا۔"

سیرالیون کے کریول جس تہذیبی اور ذہنی سطح کے ہیں لائبیریا کے "امریکی نژاد افریقی" بھی اُن سے مختلف نہیں ہیں۔" وہ مقامی افریقی باشندوں کو اب بھی "دیسی" کہہ کر پکارتے ہیں۔ باقی افریقیوں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو نئی دنیا سے واپس لوٹا ہوُا برتر انسان سمجھتے ہیں۔ آج ڈیڑھ سو سال بعد بھی ملک کی آٹھ لاکھ (سرکاری اطلاعات کے مطابق بیس لاکھ) آبادی میں سے امریکی نژاد افریقیوں کی تعداد صرف پچاس ہزار ہے۔"

(باقی)